Islamic Thought and its Characteristics

Ubaidullah Fahd Falahi[*]

ABSTRACT

Quran and Sunnah are the basic sources of Islamic thought; however, analytical reasoning (*ijtihād*) occupies a pivotal position in shaping it as well. Islamic thought covers a range of areas from the foundational texts to law, theology and philosophy etc. It has tendency to present unprecedented solutions in response to new issues which are emerging from cultural and civilizational changes. The reconciliation of the eternal texts such as Quran and Sunnah with these evolving circumstances is an inherent feature of Islamic thought. Islamic thought is distinguished with specific features like monotheism, combination of religious and mundane sciences, equilibrium between constant and variable notions, and freedom of thought etc. This article focuses on the characteristic features of Islamic Thought and elaborates their various dimensions.

[*] Professor, Department of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, India. (drfahadamu60@yahoo)

فکرِ اسلامی اور اُس کے امتیازات

عبید اللہ فہد فلاحی ۞

نظریے اور فلسفے کا اجتماع

قرآن کریم اور سنت مطہرہ اسلامی فکر کے بنیادی اور ابدی مصادر ہیں۔ قرآن اور حدیث سے ہی فکر اسلامی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ معاصر حالات اور زمانے کے تقاضوں کی رعایت میں ان دونوں بنیادی مصادر سے روشنی حاصل کر کے فکر اسلامی پروان چڑھتی ہے۔ نصوص اسلامی کی معاصر تفہیم میں تعقل و تفلسف کی بڑی اہمیت ہے۔ مخاطب کی نفسیات، بدلتے حالات کا ادراک، نت نئے اسلوبِ تخاطب اور فکری و عملی بحرانوں کی شناخت وہ اہم مسائل ہیں جن سے فکر اسلامی کو سابقہ پڑتا ہے، اس لیے فکر اسلامی نظریہ بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ نظریہ اس لیے ہے کہ وہ دوسرے رجحانات، افکار اور طرز زندگی کے مقابلے میں جامع اور مکمل ہے، انسانیت کے لیے نافع اور قابل قبول ہے اور اسی لیے غلبہ و اقامت کا آرزومند ہے۔ اسلامی فکر کو بھی فلسفہ کہا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں وسعت، تنوع اور گہرائی ہے، دوسرے افکار اور خیالات کو اپنے اندر سمونے اور ڈھالنے کی گنجائش ہے۔ تہذیب و ثقافت اور مظاہر کے بدلتے سانچوں کو اپنانے کی روایت ہے۔ تجدید و اصلاح کے فریضے نے امت مسلمہ کے مفکرین اور دانش وروں کو تاریخ اسلامی کے ہر دور میں آمادہ کیا کہ وہ قرآن و سنت کی بہتر تفہیم و تشریح کے لیے بدلتے رجحانات اور داخلی و خارجی بحرانوں کا مطالعہ کریں، نئے علوم و افکار سے بہتر تعامل کریں، خارج کے اثرات و مؤثرات کا تجزیہ کریں اور زمانے کے نبض شناس بن کر فکر اسلامی کی ترجمانی کریں۔

اسلامی فکر نے اسی لیے تاریخ اسلامی کے آغاز سے ہی اجتہاد کی روایت کو اختیار کیا ہے۔ اجتہاد نام ہے قرآن و سنت کے ابدی نصوص کا گہرا ادراک حاصل کرنے کا جسے قرآن نے تفقہ فی الدین[1] کا نام دیا ہے۔ حالات کی تبدیلی ہمیشہ جمود و انجماد کے علیٰ الرغم ترقی و اقدام کا مطالبہ کرتی ہے۔ نصوص کی ابدیت و ختمیت کو تغیر پذیر زمانے سے ہم رشتہ و ہم رکاب کرنا فکر اسلامی کا اوّلین کام ہے۔ بحران وہاں رونما ہوتا ہے جہاں ابدی وحی اور بدلتے حالت میں صحیح ڈھنگ سے تعامل نہیں ہو پاتا۔ یا تو اسلامی نصوص کی روایت پرستانہ تعبیر و تفہیم پر اصرار ہونے لگتا

۞ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، انڈیا۔(drfahadamu60@yahoo)

۱۔ القرآن، ۹: ۱۲۲۔

ہے یا جدّت پسندی کے زعم میں نصوص سے دست کش ہونے یا اُن کی من مانی تاویل کرنے کی راہ وا کر دی جاتی ہے۔ یہ افراط و تفریط فکر اسلامی کے لیے زہر ہلاہل ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہدایت صرف کتاب اللہ اور سنت رسول سے حاصل ہو سکتی ہے۔ وحی کے سوا ہدایت کے تمام راستے فریب اور دھوکہ ہیں۔ کتاب و سنت کی نصوص نا قابل تغیر ہیں۔ قیامت تک ان نصوص میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، مگر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ نصوص اسلامی کی تفہیم و تشریح حالات و زمانہ کی روایت سے بدلتی رہے گی۔[۲] تجدید واحیاے دین کی فطرت یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں نئے اسلوب میں دین کی ترجمانی ہو تا کہ زمانے کے تغیر اور نصوص کی ابدیت میں ہم آہنگی بر قرار رہے اور یہ کام اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اجتہاد کے عمل میں خطا و صواب دونوں کا احتمال رہتا ہے اور نیت درست ہو تو اجتہادی غلطی بھی باعث اجر ثواب ہوتی ہے، اس لیے اسلامی فکر کے ارتقا کے لیے توسع اور تحمل کی روایت ناگریز ہے۔ تحمل نہ ہو تو فکری پیش رفت پر قدغن لگ جاتی ہے اور اجتہاد و تخلیق کا کارواں تھم جاتا ہے۔

فکرِ اسلامی کے امتیازات

فکرِ اسلامی کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے کہ اُس کی امتیازی خصوصیات پر گفت گو کی جائے۔ قرآن وحدیث کے حوالے سے وجود میں آنے والی ہر تحریر یا بیان کو فکرِ اسلامی کا ترجمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بعض نادان یا ابن الوقت علما اور دانش وروں نے زمانے کے ہر رجحان، فکر، نظریے اور سوچ پر اسلام کا لیبل لگا دیا اور اس کی تائید و توثیق کے لیے قرآن و سنت سے دلیلیں فراہم کر دیں۔ "اسلامی جدیدیت"، "اسلامی جمہوریت"، "اسلامی اشتراکیت"، "اسلامی آمریت"، "اسلامی تکثیریت"، "اسلامی گلوبلائزیشن"، "اسلامی نسائیت"، "سیاسی اسلام"، وغیرہ درجنوں اصطلاحات ہیں جو اپنوں کی جہالت یا اغیار کی جہالت اور دشنام طرازی کی وجہ سے ذرائع ابلاغ میں گشت کر رہی ہیں۔ فکر اسلامی کو اس پیوند کاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام کی ترجمان وہی فکر ہو گی جو قرآن و سنت کے نصوص میں پوری طرح پیوست اور اس کے مجموعی نظام فکر و عمل سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔ دوسرے

۲- تجدید کی اصطلاح اس حدیث میں استعمال ہوئی ہے جسے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی السنن میں کتاب الملاحم، باب مایذکر في قرن المائة، ۲: ۲۳۳ میں نقل کیا ہے۔ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مأة سنة من يجد دلها دينها." (یقیناً اللہ اس امت کے لیے ہر صدی میں ایسے لوگوں کو بھیجے گا جو اس امت کے لیے اس کے دین کی تجدید کریں گے۔)

لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسی فکر کو اسلام کے نام سے موسوم کیا جائے گا جو قرآن کے جہانی نظریے یعنی عقیدۂ توحید سے مطابقت رکھتی ہو۔

۱۔توحید کی ترجمانی

قرآن کریم میں توحید کے عقیدے کو مرکزی مقام حاصل ہے جس کے ارد گرد اس کی تمام تعلیمات گھومتی ہیں۔ کوئی فکر اسلام کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی، جب تک اس کی جڑیں اس عقیدے کے اندر پیوست نہ ہوں۔ جب ایک انسان عقلی و فطری بدیہی عقیدے کے طور پر توحید پر ایمان لاتا ہے تو اس کے وجود اور شخصیت میں، اُس کی ذات اور ضمیر میں، دوسرے انسانوں سے اور کائنات کے ساتھ اس کے معاشرتی تعامل میں یہ عقیدہ جوہری کردار ادا کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں "آیت الکرسی" بڑی جامع آیت ہے۔ اس میں اللہ کی ایسی مکمل معرفت بخشی گئی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ اسی بنا پر حدیث میں اُس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔[۳] قرآن کہتا ہے:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ﴾ (القرآن ۲: ۲۵۵۔)

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی، جو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اُونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفتِ ادراک میں نہیں آ سکتی، الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دینا چاہیے۔ اُس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔

اللہ کی وحدانیت کا یہ تصور سورج کی طرح روشن ہے، ردِّ شرک اور ردِّ شفاعتِ باطلہ کے باب میں بالکل واضح ہے۔ قرآن نے اُن تمام معبودوں کی نفی کر دی، جو زندہ ہیں اور نہ زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ شفاعت کے اُس تصور کا بالکل خاتمہ کر دیا جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ بعض شرکا کو خدا کے ہاں اعتماد اور تدلل کا یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی کے لیے خود بڑھ کر خدا سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا اُن کی نازبرداری میں لازماً ان کی سفارش قبول

۳۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، **تفہیم القرآن** (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، جنوری ۱۹۸۱ء)، ۱: ۱۹۵۔

بھی فرمائے گا۔ قرآن نے اللہ کے علم کی وسعت اور اس کی بے کناری کی وضاحت بھی کر دی اور دوسروں کے علم کی محدودیت بھی بتادی؛ آخر میں اللہ کے "علی" اور "عظیم" ہونے کی صراحت کر کے انسانوں کو متنبہ کر دیا کہ اُس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو۔ اپنی صفات کے باب میں جو کچھ وہ خود بتاتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بچو۔[۴]

قرآن کریم کی اس واضح، روشن اور شفاف تعلیم کے باوجود مسلمانوں کے توحید کے عقیدے کو اوہام، روایات، بدعات و خرافات اور رسم جاہلیت کی دبیز بدلیوں میں اس طرح چھپا دیا۔ مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۸۸ء– ۱۹۵۸ء) نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں مسلمانوں کو للکارا تھا:

قریش مکہ نے اپنے بڑوں کی مورتیں بنا رکھی تھیں، ہم نے دنیوی تاج و تخت اور حکام و امرا کو اُن کی جگہ دے دی ہے۔ تم ان سے اس طرح ڈرتے اور ان کے نام سے کانپتے ہو جو صرف خدا ہی کے ساتھ سزاوار تھا۔ تم ان کا ذکر اس احترام و عظمت سے کرتے ہو جو صرف خدا ہی کا حقِ خالص تھا۔ تم ان کے آگے اس عاجزی اور ذلت سے جھکتے ہو جو صرف خدا ہی کے سامنے زیب دیتی تھی۔ تم ان کے احکام جائزہ اور اوامر مستبدہ کی اس طرح بلاچوں وچرا تعمیل کرتے ہو جس کا حق خدا کے سوا کسی ہستی کو نہ تھا۔ تم خدا کے گھر کے اندر ان کا ذکر کرتے اور ان کی تعریف و تہنیت میں گیت گاتے ہو اور ان کے حکموں اور فرمانوں کا منبروں پر چڑھ چڑھ کر اعلان کرتے ہو پھر اگر یہ شرک فی الصفات نہیں تو کیا ہے؟ کیا شرک و بت پرستی بغیر پتھر کی مورت اور بغیر قربانی کے بچھڑے کے ممکن نہیں؟ کیا شرک و بت پرستی کا گھر دل اور ارادہ نہیں، بلکہ مندر کا کلس اور پوجا کا چبوترہ ہے؟[۵]

قرآن کے تصور توحید کا لازمی معاشرتی ظاہرہ وحدت بنی آدم کا نظریہ اور عمل ہے۔ تمام انسان بحیثیت انسان کے قابل تکریم ہیں اور قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ سماجی نابرابری، معاشی ناہمواری، ذات اور برادری کا بھید بھاؤ، مذہب اور نظریے کی تفریق۔ ان میں سے کوئی چیز کرامت و توقیر سے انسان کو محروم نہیں کر سکتی۔ ہمارے یہاں مختلف لوگوں کی تحریروں میں ایسا کافی مواد موجود ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ خیر سگالی کے بجائے نفرت کی فضا ہموار کرتا ہے قرآن عام انسانوں سے رابطے کی بنیاد توقیر و تکریم اور محبت و مواسات کو قرار دیتا ہے، عداوت و نفرت کو نہیں اور مواسات اور تکریم کی یہ تعلیم قرآن کے عقیدۂ توحید کا لازمی ثمرہ ہے۔

۴– امین احسن اصلاحی، **تدبر قرآن** (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۹۷٦ء)، ۱: ۵۴۴– ۵۴٦۔

۵– ابوالکلام آزاد، **مقالات الہلال** (لاہور: دبستان، ۱۹۵۵ء)، ۳۸۔

قرآن کے عقیدۂ توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ فکر کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ فکری وحدت انسان کو وحی، عقل اور کائنات کے درمیان ایک معتدل و متوازن تعامل کے لیے تیار کرتی ہے۔ انسان ایک صاحب اختیار وارادہ معزز و مکرم مخلوق ہے جو عقل رکھتا ہے اور اسباب و شبہات کے قوانین اور نوامیس فطرت کے مطابق زندگی اور اس کے متعلقات میں تصرف، تدبیر و تدبر اور اخذ و ادراک کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ وہ حق کی راہ اپنا کر سربلند ہوتا ہے اور حق سے دور ہو کر طغیان و فساد اور زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحمید احمد سلیمان (۱۳۵۵ھ /۱۹۳۶ء) کے بقول یہ فکری وحدت ایک مسلمان کو "عالم غیب اور عالم شہادت کے درمیان تکامل کا منہج بھی عطا کرتی ہے۔"[۶] وحی اور عقل کے درمیان ہم آہنگی فکر اسلامی کا امتیاز ہے۔ تاریخ اسلامی کے ہر دور میں مفکرین و مصلحین نے اس موضوع سے خاطر خواہ دل چسپی لی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ء–۱۳۲۸ء) نے اپنی شاہ کار تصنیف درء تعارض العقل و النقل میں عقل و نقل کے درمیان مطابقت پر معرکہ آرا بحثیں کی ہیں۔ یہ بحثیں فکر اسلامی کی تفہیم میں کافی معاون ہیں۔

عقیدۂ توحید کے بطن سے جنم لینے والی اس فکری وحدت میں "غیب و شہادت ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ وحی اور عقل ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہاں ایمان اور عمل میں مکمل ہم رشتگی ہے۔ توکل اور سعی وجہد میں باہم تعلق ہے۔ عقیدۂ قضاو قدر، ربانی اصول و مبادی اور اوامر الٰہیہ پر اعتماد و توکل کا زبردست رابطہ ہے، اسباب و سنن اور فطرت کو جاننے، سمجھنے، ان کی جست جو کرنے اور ان کی مکمل حرص رکھنے کے ساتھ یہی انسان کی ذمہ داری اور اس کا مقصد وجود بھی ہے اور ایمان صادق اور تسلیم ورضا کا وسیلہ بھی۔ اسی لیے اللہ نے ایمان کو، جو حسن نیت کا مظہر ہے، عمل صالح سے جوڑ دیا ہے۔[۷] ڈاکٹر عبدالحمید یہ سمجھتے ہیں کہ فکر اسلامی اگر تاریخ میں اپنے عظیم الشان کردار کا احیا چاہتی ہے تو ناگزیر ہے کہ:

۶– ابو سلیمان عبد الحمید احمد، **فکر اسلامی کا بحران** (أزمة العقل المسلم کا اردو ترجمہ) مترجم، عبید اللہ فہد (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۲۰۰۱ء)، ۱۲۶– ۱۳۴۔

۷– نفس مرجع، ۱۳۳؛ فاضل مصنف نے ایمان کے ساتھ عمل صالح کے قرآنی تذکرے میں صلاح اور صالحیت سے مراد لیا ہے فہم و ادراک کی معروضیت اور وحیٔ الٰہی کے مطابق حق کی اساس پر سعی طلب کی نفع آوری۔ مصنف کا خیال ہے کہ صالحیت کے لیے نیت اور ارادہ کا اخلاص کافی نہیں ہے بلکہ اسباب کی جستجو اور عمل کا اخلاص بھی شامل ہے۔ ان کے خیال میں فکر اسلامی اس وقت ضعف وزوال کا شکار ہوئی جب عالم غیب کے معاملات سے متعلق امور و کلیات میں بحثوں میں وہ مبتلا ہوگئی اور اس نے عالم شہادت میں دل چسپی لینا کم کر دیا اور تدبیر و تسخیر کائنات کے لیے جدوجہد سے صرف نظر کرنے لگی۔

وہ اپنے اس اسلامی نکتہ نظر کو واپس لائے جس کی بنیاد توحید اور وحدانیت ہو، جس میں مقصدیت کا التزام ہو، اسباب و مسببات کے قانون کی بھرپور رعایت ہو، جس میں غیب اور شہادت مل کر جسد واحد بن جائیں، وحی و فطرت میں تکامل اور واحدنیت ہو اور اس طرح انسانیت کا سفر درست ہو جائے اور عقل انسانی کی راہ بھی جادۂ مستقیم میں تبدیل ہو جائے اور اس سعی وجہد کو خدا کا وعدۂ نصرت و فتح حاصل ہو سکے۔[۸]

۲۔تدبرّاور تدبیر کی ہم رشتگی

فکر اسلامی کا دوسرا امتیاز وہ ہے جسے ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی (۱۹۳۵ء) نے علم تدبر اور علم تدبیر کے اجتماع سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے حقوق کی ادائی میں محض اس کے الفاظ کی تلاوت ہی کافی نہیں، بلکہ اس پر تدبر بھی ضروری ہے، تاہم تدبر کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کا منہج وہی ہو جسے قرآن نے خود متعین کر دیا ہے۔ تدبیر کا مطلب ہے بحرانوں اور مشکلات سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرنا۔ یہ تدبر قرآن کا حاصل اور اس کا ثمرہ ہے۔ تدبر کے بغیر جو تدبیر ہوگی، وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے یا کسی منصوبہ بندی کے بغیر فوری اور عاجلانہ قدم اٹھانے کی مانند ہوگی۔ قرآنِ کریم کتابِ زندگی ہے۔ ہم اس پر غور و تدبر کرتے ہیں تاکہ اس سے ہدایت حاصل کر کے زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو حل کر سکیں۔ تدبر اور تدبیر کے دونوں منہج ہم رشتہ ہو جائیں تو زندگی پر مسرت اور پاکیزہ بن جاتی ہے۔ فکر اسلامی تدبر اور تدبیر کو جمع کر کے تربیت، تزکیے اور تعمیر کائنات کا فریضہ ادا کرتی ہے۔[۹]

قرآن حکیم سے استفادے کے لیے تدبر ایک ناگزیر شرط ہے۔[۱۰] اس شرط کا ذکر قرآن بار بار کرتا ہے: ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء، ۴: ۸۲)

۸۔ نفس مصدر، ۱۴۳۔

۹۔ طٰہٰ جابر العلوانی، **أفتلایتدبرون القرآن (منهية التدبر و التدبير) تدبر قرآن کے اصول اوروسائل (تدبر اور تدبیر کی منہاجیات)** اردو ترجمہ، (نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف ایجیکٹو اسٹڈیز، ۲۰۱۲ء)، ۱۷۔ ۱۸۔

۱۰۔ امین احسن اصلاحی نے فہم قرآن کے طالبوں کے لیے پانچ شرطیں ناگزیر قرار دی ہیں: ۱۔نیت کی پاکیزگی، ۲۔قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے، ۳۔ قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم، ۴۔تدبر اور ۵۔اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا۔ اس سے پہلے فاضل مفسر نے فہم القرآن کے خارجی و داخلی شرائط کا تذکرہ کیا ہے اور انہیں "علمی و فنی نوعیت" کی شرطیں قرار دیا ہے۔ بقیہ یہ پانچ شرطیں "دل کے رخ کو صحیح رکھنے کے لیے" بیان کی ہیں۔ (اصلاحی، **مبادیِ تدبر قرآن** (لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء)، ۱۵ ومابعد۔)

(کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔) ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد، ۴۷: ۲۴) (کیا ان لوگوں نے قرآن میں غور نہیں کیا، یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟) ﴿کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص ۳۸: ۲۹) (یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔)

آخری آیت میں تدبر اور تذکر کی دونوں اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ تدبر بغیر تذکر کے ایک بے جان اور بے سود عمل ہے اور تذکر بغیر تدبر کے ہو تو اجتہاد و تخلیق کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اور جمود، روایت پسندی اور اضمحلال طاری ہو جاتا ہے۔ تذکر ہی ایک جامع شکل تدبیر ہے جو تدبر کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

محض تبرک کے طور پر الفاظ قرآن کی تلاوت کر لینا، حضرات صحابہ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا، جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ زندگی کے مسائل سے قرآن عظیم کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جان کنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ "مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ موجودہ صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

> دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن حکیم سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ اس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہی ایک کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی کتاب بھی پڑھنے کے لیے لوگ کھولتے ہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے اپنے دماغ کو حاضر کرتے ہیں، لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کو یہ انوکھی روش ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بالعموم سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔[۱۱]

تدبر ایک جامع ترین اصطلاح ہے جس کے اندر وہ تمام معانی موجود ہیں جو تفکر، تذکر، نظر، فہم، تعقل وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ ویسے اس کا متبادر مفہوم ہے کہ ایک طرف اشیا کے انجام و عواقب پر غور و فکر ہو اور دوسری طرف تدبیر امور کے بدیہی اقدامات اور اہم ابتدائی انتظامات تدبر کے لوازم کے طور پر سامنے آئیں، جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی صراحت کرتے ہیں۔[۱۲]

۱۱- نفس مصدر، ض۔

۱۲- العلوانی، نفس مصدر، ۴۸۔

امام الراغب اصفہانی ؒ (۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء) کہتے ہیں: تدبیر کا مطلب ہے معاملات کے انجام پر غور و فکر کرنا۔ تدبیر یہ ہے کہ آدمی کوئی اقدام کرے اور اس کے انجام سے غافل نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے: ﴿**فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا**﴾ (النازعت ۷۹: ۵) (اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو احکام الٰہی کے مطابق معاملات کا انتظام چلاتے ہیں۔)[۱۳] امام ابو حامد الغزالی ؒ (م ۵۵ھ / ۱۱۱۱ء) فرماتے ہیں کہ تدبر حضوری قلب سے آگے کا پڑاؤ ہے۔ قراءت سے مقصود تدبر ہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اس قراءت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبر شامل نہ ہو۔ اگر دہرائے بغیر وہ تدبر نہ کر سکے تو پڑھی ہوئی آیتوں کو دوبارہ پڑھے:"لا خير في عبادة لافقه فيها ولا في قراءة لا تدبر فيها واذا لم يتمكن من التدبر إلا بترديد فليردد إلا أن يكون خلف إمام." [۱۴] (اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں فہم اور تفقہ موجود نہ ہو اور اس تلاوت میں کوئی لطف نہیں جس میں تدبر شامل نہ ہو۔ اگر دہرائے بغیر تدبر کرنا ممکن نہ ہو تو خواندہ آیتوں کی تکرار کرے اِلاّ یہ کہ وہ مقتدی ہو۔)

امام غزالی ؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بیس مرتبہ دہرایا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بار قیام لیل کے لیے کھڑے ہوئے تو اس آیت ﴿**اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ**﴾ کو مسلسل دہراتے رہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ تکرار اس لیے تھی کہ آپ اس پر غور و تدبر کر سکیں۔[۱۵]

علم تدبیر پر مفصل گفت گو استاذ حامد ربیع نے اپنی کتاب **مستقبل الإسلام السياسي** میں کی ہے۔[۱۶] ابن ابی الربیع (وفات ۲۷۷ھ / ۸۴۳ء) کی مشہور کتاب **سلوک المالک في تدبير الممالک** پر اپنے مقدمے میں بھی حامد ربیع نے صراحت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "علم تدبیر کی جڑیں ہمارے عربی علوم و روایات میں

۱۳۔ الراغب الاصفہانی، **المفردات في غريب القرآن** (کراچی: نور محمد اصح المطابق، ۱۹۶۴ء) ۱۶۴۔

۱۴۔ ابو حامد محمد الغزالی، **إحياء علوم الدين**، (بيروت: دار الكتب العلمية، ۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۱ء)، ۱: ۲۶۵۔

۱۵۔ نفس مصدر؛ امام غزالی نے حضرت تمیم داری ؒ اور حضرت سعید بن جبیر ؒ کے اسی طرح کے عمل کو نقل کیا ہے۔

۱۶۔ یہ کتاب **المنظمة العربيه للتربية و التعليم** کی طرف سے **معهد البحوث و الدراسات العربية** بغداد سے ۱۴۰۳ھ / ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکی ہے۔

گہری ہیں۔ جسے ہمارے اس دعوے میں شک ہو وہ شہاب الدین ابن ابی الربیع کی کتاب **سلوک المالک في تدبیر الممالک** کا مطالعہ کرے، جس میں مصنف نے ایک مکمل فصل ان بحثوں کے لیے خاص کی ہے جنھیں آج کی اصطلاح میں "سیاسی منصوبہ بندی کا علم" کہا جاتا ہے۔ سیاسی منصوبہ بندی محض خیال، تصور یا تاثر کا نام نہیں ہے، یہ ماضی و حال کی روشنی میں مستقبل سے بحث کرنے کا نام ہے۔ یہ علم متوقع حالات یا مختلف واقعات کی دنیا میں تغیر پذیر کیفیات اور اشیا کے اطلاق کا مطالبہ کرتا ہے۔ حامد ربیع نے علم تدبر اور علم تدبیر کے درمیان ربط پیدا کیا ہے اور مستقبل کے انجام و عواقب کے ادراک سے انھیں مربوط کیا ہے۔ اس طرح علم تدبر انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایسے مستحکم عمرانی نظریے کی تشکیل کرے جو ماضی و حال کو محیط ہو اور مستقبل کی تعمیر اور اس کی صورت گری کا رجحان رکھتا ہو اور یہ مستقبل دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہے۔ (۱۷)

علم تدبر اور علم تدبیر کے اجتماع کو ڈاکٹر العلوانی نے **الجمع بین القراء تین** کا نام بھی دیا ہے۔ قرآن مجید وحی الٰہی پر مشتمل کتاب ہے اور یہ کائنات اپنی تمام اشیا کے ساتھ اللہ کے بے شمار کلمات مشیت میں سے ہے۔ قرآن اور کائنات دونوں مل کر کلمات الٰہی کا مجموعہ تشکیل دیتے ہیں اور ان دونوں کو جمع کرنے اور دونوں کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے وحدتِ فکر وجود میں آتی ہے۔ اسی کو سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء– ۱۸۹۸ء) نے 'ورڈ آف گاڈ' اور 'ورک آف گاڈ' سے تعبیر کیا ہے جس کے اندر تناقض اور تضاد کی موجودگی ناممکن ہے، کیوں کہ دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ فکر اسلامی دونوں کے درمیان حسین توازن قائم رکھتی ہے۔

۳۔خلافت اور تسخیر کا لزوم

قرآن علم، خلافت اور تسخیر کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیات ۳۰ تا ۳۳ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات بتاتی ہیں کہ انسان کو خلافت ارضی کی ذمے داری اس کے علم کی وجہ سے ملی ہے۔ انسان کو جو علم خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے اس کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیا کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسماے اشیا پر مشتمل ہیں۔ آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔ (۱۸) اس لیے قرآن نے اعلان کیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرہ، ۲: ۳۱) (اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔)

۱۷– ربیع حامد، **مستقبل الإسلام السیاسی** (بغداد: مهد البحوث و الدراسات العربیة، ۱۹۸۳ء)، ۵۔

۱۸– مودودی، ***تفہیم القرآن***، ۱: ۶۳۔

علم کی بنیاد پر انسان کو ملنے والی اس خلافت کے کچھ تقاضے ہیں جن کے پورا ہوئے بغیر خلافت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا:

۱- انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر اللہ کی طرف سے اختیار اور ارادہ تفویض ہوا۔ مقصد انسان کا امتحان لینا تھا کہ وہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔

۲- خلافت کے منصب کا تقاضا ہوا کہ اس کی رہ نمائی کے لیے شریعت وہدایت نازل کی جائے۔

۳- خلیفہ ہونے کی وجہ سے انسان شتر بے مہار نہیں ہے، وہ خدا کے ہاں جواب دہ اور مسئول ہے۔

۴- یہ خلافت غیر مشروط نہیں ہے۔ اس کے جائز حق دار وہی ہیں جو خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں۔

۵- یہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ انسانوں کو خلافت کے مقاصد بروے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے۔

۶- خلافت خیر و فلاح کی ضامن اسی وقت تک رہے گی، جب تک اللہ کے احکام و ہدایات کی پاس داری ہو گی۔[(۱۹)]

سورۃ البقرۃ کی ان آیات میں علم کا حوالہ کئی بار دیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو اللہ نے انہیں اشیا کا علم عطا کیا۔ فرشتوں سے اللہ نے سوال کیا کہ خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا تو تم خود ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں کا جواب تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (البقرۃ ۲: ۳۲) (نقص سے پاک ہے آپ کی ذات ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے حقیقت میں تو ہی سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا ہے۔)

خدا کے حکم پر حضرت آدم علیہ السلام نے جب ان چیزوں کے نام بتا دیے تو گویا ان کی فضیلت تسلیم کر لی گئی اور خلافت کے لیے ناگزیر بنیادی شرط کی موجودگی ثابت کر دی گئی۔ تب اللہ کا یہ قول فیصل سامنے آیا: ﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ (البقرۃ ۲: ۳۳) (میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اسے بھی جانتا ہوں۔)

۱۹- اصلاحی، **تدبر قرآن**،۱: ۱۲۷- ۱۲۸۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا منصب انسان کو اس کی علمی صلاحیت کی وجہ سے۔ یہ علم دین و دنیا کی ان تمام تفصیلات کا احاطہ کرتا ہے جو خلافت کے فریضے کی ادائی کے لیے ناگزیر ہیں۔

منصب خلافت اور اس کے لیے ناگزیر اہلیت کو بیان کرنے والی دوسری آیات سورۃ ص کی ہیں جہاں حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کا تفصیلی تذکرہ ہوا ہے۔ حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کو اس سورہ میں ہدایت دی گئی کہ انھیں جو اختیار و اقتدار خلیفہ کی حیثیت میں ملا ہے اسے خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کریں، لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہش نفس کی پیروی نہ کریں۔ ﴿اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (ص ۳۸: ۲۶) (اے داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے، ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔)

یہاں خلافت کا تذکرہ حق و راستی اور عدل و انصاف والی حکومت کے قیام کے ساتھ ہوا۔ سورۃ البقرۃ میں خلافت کے لیے ناگزیر طور پر جس علم کا تذکرہ ہوا تھا، یہاں اس کی مزید تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ علم کے جلو میں سیاست و قیادت آتی ہے۔ یہ قانون فطرت ہے۔ دنیا میں اسی قوم نے امامت کی ہے جو علوم و فنون سے مسلح ہو کر اٹھی ہے۔ مسلمانوں نے تاریخ کے صفحات میں ایک غالب و حاکم قوم کی حیثیت سے اسی وقت اپنی جگہ بنائی اور مدتوں دنیا کی قیادت کا فریضہ انجام دیا، جب وہ علوم و فنون کے میدان میں ساری اقوام کی سیادت کر رہے تھے۔

اس سورہ میں حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کی متعدد صفات اور قابلیتوں کا بیان ہوا ہے۔ یہ سب ایک خلیفہ کی مطلوب صفات ہیں۔ آیت ۱۷ میں قرآن کہتا ہے: ﴿اِصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ﴾ (ص ۳۸: ۱۷) (اے نبی (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)! صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں، اور ان کے سامنے ہمارے بندے داوٗد (عَلَیْہِ السَّلَام) کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔)

یہاں حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کو صاحب قوت و جمیعت، پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے اور ساتھ میں ان کی اوّابیت کی صفت بھی بیان کی گئی ہے۔ قوت و سطوت کے ساتھ رجوع الی اللہ اور خشیت و انابت کی کیفیات کی یک جائی اضداد کا اجتماع تصور کیا جاتا ہے، مگر خلافت کے لیے ان اضداد کا اجتماع ناگزیر ہے۔ خلیفہ، صاحب سطوت و جبروت اور بااقتدار و اختیار ہوتا ہے مگر وہ خود مختار اور شتر بے مہار نہیں ہوتا۔ حضرت داوٗد عَلَیْہِ السَّلَام کی

قوت وصولت کا مزید بیان ہوتا ہے: ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص ۳۸: ۲۰) (ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔)

یہاں حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کے مستحکم اقتدار کی وضاحت حکمت اور فصل خطاب کی دو مزید صفات کے ذریعے کی گئی ہے۔ حکمت و دانش مندی اور فیصلہ نزاعات کی صلاحیت دراصل حکومت کو استحکام عطا کرتی ہے۔ پھر اس پر مستزاد رجوع اور انابت کی کیفیت غرور و استکبار سے انسان کو محفوظ رکھتی ہے۔ آیت ۱۷ میں ذَا الْاَيْدِ اور اَوَّابٌ کی دونوں صفتوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ "کوئی صاحب قوت و حکومت شخص اللہ تعالیٰ کا منظور نظر بندہ اس وقت بنتا ہے جب قوت و شوکت کے ساتھ اس کے اندر اوّابیت کی صفت پائی جائے۔ اگر قوت وصولت اس کے اندر عزت و شقاق کی رعونت پیدا کر دے تو یہ نمرودیت و فرعونیت ہے جو اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے۔[۲۰]

اس سورہ میں حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کی ایک اور صفت بھی بیان کی گئی ہے جو منصب خلافت کے ساتھ مشروط ہے اور وہ ہے تسخیر کی صفت، جو قوت وصولتِ علم کے جلو میں حاصل ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں یہ کائنات اذن الٰہی سے مسخر ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت داؤد عَلَیْہِ السَّلَام صبح و شام دامن کوہ میں بیٹھ کر اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے تو پہاڑ بھی ان کی ہم نوائی کرتے اور پرندے بھی جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو کر ان کی سُر میں اپنی سُر ملاتے۔ اللہ نے ان کے پر سوز لحن اور ان کے درد مند دل میں ایسی تاثیر و تسخیر رکھی تھی کہ ان کے ارد گرد کی پوری فضا ان کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھتی اور دشت و جبل، چرند و پرند سب توبہ و مناجات کے لیے ان کے شریک بزم بن جاتے۔[۲۱] فرمایا: ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۙ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ﴾ (ص ۳۸: ۱۹) (ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، پرندے سمٹ آتے؛ سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔)

سورۂ انبیا میں اس صفت تسخیر کی مزید وضاحت ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ﴾ (الانبیاء ۲۱: ۷۹- ۸۰) (داؤد عَلَیْہِ السَّلَام کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے اس

۲۰- اصلاحی، **تدبر قرآن**، ۵۲۰۔
۲۱- نفس مصدر۔

فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے اور ہم نے اس کو تمھارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟)

فکر اسلامی خلافت اور تسخیر کے اس لزوم کو واضح کرتی ہے۔ وہ نشان دہی کرتی ہے کہ علم سے مسلح ہو کر ہی خلافت کی ذمے داری ادا کی جا سکتی ہے اور خلافت تسخیر کائنات کی اہلیت کو مستلزم ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی میں مسابقت اور اسے تعمیر انسانیت کے لیے استعمال کرنے کی اہلیت و قابلیت کا حصول خلافت کی ادائی کے لیے شرط ہے۔ اسی لیے قرآن نے قوت و طاقت کے حصول کا اہل ایمان کو حکم دیا ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (الانفال ۸: ۶۰)

اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمھارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا۔

۴۔ثبات بھی، تبدیلی بھی

فکر اسلامی کا ایک امتیاز ثبات اور تبدیلی کو جمع کرنا ہے۔ بلاشبہ قرآن حکیم کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث ناقابل تغیر ہیں۔ ان میں ادنیٰ تبدیلی کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ حالات اور زمانے کی تمام ترقیوں، علوم و فنون کی تمام دریافتوں اور مسائل و مباحث کی تمام پیچیدگیوں کے باوجود ان اسلامی نصوص میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ کو خود بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ قرآن میں اپنی طرف سے کوئی ترمیم، حذف یا اضافہ کر سکیں۔ اس کی صراحت خود قرآن نے کر دی ہے: ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗءِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾(یونس ۱۰: ۱۵) (جب انھیں ہماری واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اے محمد ﷺ! ان سے کہو "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔")

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے قرآن میں ترمیم کرنے کا مطالبہ اول تو اس مفروضہ پر مبنی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انھوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی۔ اگر رہ نمائی کے لیے اٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں اتنی لچک ہی پیدا کرو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ اس کے جواب میں اللہ کے رسول نے صراحت کر دی کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں، بلکہ یہ وحی کے ذریعے سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی رد و بدل کا مجھے اختیار نہیں اور یہ بھی کہ اس معاملے میں مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو، ورنہ پورے کو رد کر دو۔[۲۲]

کتاب اللہ اور سنت رسول کے نصوص ابدی ہیں، کیوں کہ وہ وحی الٰہی کا حصہ ہیں مگر اُن کا فہم، ان کی تشریح و تعبیر بلاشبہ انسانی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ یہ کوششیں بہت مبارک اور مسعود ہیں اور اپنے دور اور حالات کے اعتبار سے بہت مفید اور مطابق واقعہ ہیں، مگر انھیں وحی الٰہی کا درجہ بہر حال نہیں دیا جا سکتا کہ ان میں کوئی ادنی ترمیم نہ ہو سکے، نہ وہ بدلتے حالات کے تقاضوں کی ہمہ وقت رعایت کر سکتی ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے۔ یہیں سے فکر اسلامی تبدیلی کے عمل کو قبول کرتی ہے۔

پروفیسر محمد تقی امینی (۱۹۲۶ء– ۱۹۹۱ء) نے اسلام کے فقہی و قانونی نظام کی تشکیل جدید پر گفت گو کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ معاشرے کی حالت ہمیشہ یکساں نہیں رہتی، بلکہ اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی کبھی معمولی ہوتی ہے جو حالات کے اتار چڑھاؤ سے رونما ہوتی ہے اور کبھی ہمہ گیر ہوتی ہے جو ایک دور کے بعد دوسرے دور کے آنے سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ چند احکام و مسائل کے موقع و محل میں تبدیلی سے کام چل جاتا ہے، لیکن دوسری صورت میں چند مسائل پر بات ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے قانونی نظام کو نئے انداز میں ڈھالنے اور نئے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۲– مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲/۲۷۱– ۲۷۲، حاشیہ ۱۹، ۲۰۔

پروفیسر امینی کو اس بات کا احساس ہے کہ جب معاشرہ توانا اور مضبوط ہوتا ہے اور اس کے رہ نماؤں میں صلاحیت کے ساتھ صالحیت اور ذمے داری کا احساس موجود ہوتا ہے تو قانونی نظام کی ترتیب و تدوین نو کا کام خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے۔ معاشرہ کم زور اور متزلزل ہو اور قیادت کو قومی و ملی مفاد کا شدید احساس نہ ہو یا ذاتی و گروہی اقتدار اس کی ذہنیت اور فکر پر حاوی ہو تو تشکیل و ترتیب کی بڑی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ بلاشبہ مسلم قوم کے زوال نے ایک بالکل نئے دور کو جنم دیا ہے جس کے نظریات نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور معاشرے کی جدید تشکیل نے مذہب و زندگی کے ہر شعبے میں بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں جنھیں سمجھنا اور جن کے تقاضوں اور مطالبوں کو قبول کرنا ضروری ہے۔ ”حصول مصالح اور دفع مضرت کی بہت سی شاہ راہیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ معاشی اسکیموں اور فلاحی تجویزوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ صنعت و حرفت کی وسیع پیمانے پر تنظیم ہو گئی ہے اور تجارت و زراعت کی نئے انداز میں تشکیل ہو چکی ہے۔ بات صرف حاجت و ضرورت پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ جلب منفعت اور دفع مضرت کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لیے زندگی کے موجودہ سروسامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے۔“ [۲۳]

فاضل مصنف نے بدلے ہوئے حالات کو قبول کر کے نئے فقہی و قانونی نظام کی تشکیل جدید میں چند دشواریوں کا تذکرہ کیا ہے جو بڑی اہم اور دوررس معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مذہب اور دین کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر و عمل کی وہی خصوصیات موجود ہیں جو دور زوال کی یادگار ہیں اب تک ”سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ ذہنیت“ کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

۲۔ ملکی، تنظیمی اور معاشرتی قوانین میں حالات و زمانہ کی رعایت کو تسلیم کرنا صرف زبانی ہے۔

۳۔ موجودہ ترقیات اور بدلے ہوئے حالات سے تاثر پذیری افراط و تفریط کا شکار ہے۔ عدل و اعتدال کی راہ بالکل بند ہے۔

۴۔ اعتدال و توازن کی راہ دکھانے والی نہ کوئی موثر طاقت ہے اور نہ بے چین کر دینے والا احساس۔

۵۔ تبدیلی کو قبول کرنے کی دعوت جرأت و ہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہ راست غور و فکر کی دعوت ہے لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑبندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لیے ہوئے ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے جرأت و ہمت کے مظاہرہ کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلہ کی امید بے کار ہے۔ [۲۴]

۲۳۔ محمد تقی امینی، **احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت** (دہلی: ندوۃ المصنفین، ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء)، ۲۱– ۲۲۔

۲۴۔ نفس مصدر، ۲۵– ۲۶۔

ان دشواریوں کے باوجود پروفیسر امینی نے اپنی کتاب میں ترتیب وار قرآن و سنت اور صحابۂ کرام کی زندگی سے احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت فراہم کیا اور استفادے کی تفصیلات بیان کیں معذرۃ إلی ربکم [۲۵] کی دلیل کے ساتھ اس امید پر کہ مستقبل میں طوفان کی شدت قلب و دماغ کی لہروں میں ارتعاش پیدا کر دے اور پھر ملت کی حفاظت کے لیے سفینے کی تیاری پر مجبور ہونا پڑے۔"[۲۶]

تبدیلی کو قبول کرنے کی یہ دعوت فقہی و قانونی سرمایے تک محدود نہیں ہو سکتی۔ دعوت و اصلاح اور تجدید و تنقید بلکہ پورے دین کی تعبیر و تشریح تک یہ دعوت وسیع اور جامع ہے۔ احیاے دین کی فطرت ہی یہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں مذہب کی تفہیم و تشریح از سر نو ہو۔ روایت سے آگے بڑھ کر جدت کے تقاضے ملحوظ رکھے جائیں۔ نئی تبدیلیوں کو شرح صدر کے ساتھ قبول کیا جائے اور بدلے ہوئے حالات میں دین کی نئی تعبیر و تشریح کی جائے تا کہ زمانۂ دین کی افادیت، معنویت اور حال سے اس کی مطابقت کو تسلیم کر سکے۔ فکر اسلامی تغیرات کو قبول کرتی ہے اور عصری ضروریات کی رعایت میں ایک نیا بیانیہ تشکیل دیتی ہے جو اسلامی نصوص کی عصری ترجمانی کرتا

۲۵- مولانا امینی نے بڑی دل سوزی و درد مندی کے ساتھ سورۃ الأعراف ۷: ۱۶۴ کا حوالہ دیا ہے جس میں یوم السبت کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرنے والوں کو ناصحین کے ذریعہ تنبیہ و تذکیر کا بیان ہے۔ اس مخلص گروہ کی غیرت ایمانی کی حدود اللہ کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکی اور اس نے اس خیال سے نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا کہ شاید مجرم لوگ اس کی نصیحت سے راہ راست پر آجائیں اور اگر وہ راست نہ اختیار کریں تب بھی وہ اپنی حد تک اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی براءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس کے بعد قرآن نے صراحت کی ہے کہ جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو ناصح اور مخلص گروہ ہی اس سے بچ سکا کیوں کہ اس نے خدا کے حضور اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ (القرآن ۷: ۱۶۴– ۱۶۵) (اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔" آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے، اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔)

۲۶- محمد تقی امینی، نفس مصدر، ۲۶۔

ہے۔ اس بیانیہ کی تشکیل میں حریت فکر کا کردار مرکزی ہوتا ہے بغیر آزادی فکر کوئی عصری بیانیہ ترتیب نہیں دیا جاسکتا۔

۵–حریت فکر کی پاس داری

فکری آزادی اور اس کی حدود دور حاضر کا ایک بڑا حساس اور اختلافی مسئلہ ہے۔ اس کے ڈانڈے بسا اوقات ہتک عزت اور توہین سے جاملتے ہیں۔

فکر اسلامی ہر فرد کو عقیدے اور ضمیر کی آزادی دیتی ہے۔ اظہار رائے، تنقید و انتخاب کا ہر شخص کو حق حاصل ہے اور ہر فرد اپنی رائے، عقیدے اور اظہار کے لیے جواب دہ اور ذمے دار ہے۔ تاہم ''حریت فکر کا مطلب اٹکل پچو فیصلہ کرنا اور اندھادھند جاہلانہ من مانی کرنا نہیں ہے، اس لیے کہ اسلامی منہاج کوئی الل ٹپ اور خلاف عقل طریق کار کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ فیصلے کے لیے معقول اصول اور اسالیب وضع کرتا ہے تاہم ہر حال میں ارادۂ انسانی کا فیصلہ تنہا فرد کی اخلاقی حس اور ضمیر کی تسلی و قناعت پر منحصر ہے جس میں کسی دباؤ اور جبر کا دخل نہیں ہے۔''(۲۷)

قرآن کریم کی آیات اس سیاق میں بالکل واضح ہیں۔ عقیدہ و فکر کی آزادی پر قرآن نے جتنا زور دیا، وہ مذاہب کی تاریخ میں بے نظیر ہے: ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾(۲۸) (بے شک تیرا رب اگر چاہتا تو انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کا رحم ہے۔ اس (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انھیں پیدا کیا تھا۔)

ان آیات نے بالکل صراحت کر دی کہ اللہ کی مشیت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ حیوانات اور نباتات اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی طرح اس کو بھی جبلی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوت ایمان، بعثتِ انبیا اور تنزیلِ کتب کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سارے انسان مسلم و مومن ہی پیدا ہوتے اور کفر و عصیان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ آیت کا ٹکڑا وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ بڑا معنی خیز ہے۔ انسان کی خلقت کے پیچھے مشیت الٰہی یہ ہے کہ انسان کو انتخاب

۲۷– عبدالحمید احمد، **فکر اسلامی کا بحران**، ۱۷۲–۱۷۳۔

۲۸– مودودی، **تفہیم القرآن**، ۲: ۳۷۴–۳۷۵، حاشیہ: ۱۱۶۔

واختیار کی آزادی دی جائے۔ اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے اور اس کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کی راہیں کھول دی جائیں اور پھر ہر انسان کو موقع دیا جائے کہ جس راہ کو چاہے اپنے لیے پسند کرے۔ قرآن اس لیے جبر و اکراہ کو یکسر مسترد کرتا ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ (البقرہ ۲: ۲۵۶) (دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ کر دی گئی ہے۔) ﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس ۱۰: ۹۹) (اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آتے۔ پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔)

اللہ کے رسول ﷺ تبلیغ و تزکیہ اور تعلیم و تربیت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ زبردستی کسی کو دین اسلام میں داخل کرنا آپ کے فرائض منصبی کے خلاف تھا، اسی لیے اللہ نے بار بار آپ کو یہ یاد دہانی کروائی: ﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴾ (ق ۵۰: ۴۵) (اے نبی ﷺ! جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انھیں ہم خوب جانتے ہیں، اور تمھارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ پس تم اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔) ﴿فَذَكِّرْ ڼ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیۃ ۸۸: ۲۱- ۲۲) (اچھا تو (اے نبی ﷺ) نصیحت کیے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔)

قرآن کریم نے یہ صراحت بھی کر دی کہ ہر فرد اپنی ہدایت و ضلالت کا خود ذمے دار ہے اور اس کا نفع یا نقصان اسی کے حصے میں آئے گا۔ جو شخص ہدایت کی راہ پر چلے گا اس کے حسن انجام سے وہی ہم کنار ہو گا اور جو گم راہی کے راستے کا انتخاب کرے گا اس کے برے انجام سے دوچار وہی ہو گا۔ اس لیے کسی قسم کا جبر و اکراہ، عبث اور بے سود ہے: ﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى﴾ (النجم ۵۳: ۳۸- ۴۰) (وہی کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے سعی کی ہے اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی۔) ﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (بنی اسرائیل: ۱۷: ۱۵) (جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے، اور جو گم راہ ہو اس کی گم راہی کا وبال اُسی پر ہے۔ کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔)

قرآن کریم دین اسلام کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کی آزادی ہی نہیں عطا کرتے، بلکہ امت مسلمہ کے اندر مختلف فکری دھاروں، فقہی رجحانات اور متنوع مناہج و اسالیب کے لیے بھی سند جواز فراہم کرتا ہے۔ تاریخ نے امت کے اندر نصوص اسلامی کی مختلف تعبیرات و تشریحات کا مشاہدہ کیا ہے اور امت مسلمہ کے مجموعی مفاد میں ان متنوع رجحانات کو پرورش پاتے دیکھا ہے دور رسالت میں نصوص کی متنوع تفہیم و تعبیر کی مثالیں ملتی ہیں جو آزادی فکر اور آزادی تعبیر کے لیے قندیل کا کام دیتی ہیں۔

ایک روشن مثال وہ روایت ہے جس کی تخریج امام بخاری اور امام مسلم نے کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنگ احزاب کے موقع پر صحابہ کرام سے فرمایا: "لا يصلين أحد العصر إلا في بني قريظة" (نماز عصر بنی قریظہ میں ادا کرنا۔) بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز عصر کا وقت ہو گیا؛ چناں چہ بعض صحابہ نے کہا: ہم بنو قریظہ پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کریں گے، جب کہ دوسرے صحابہ نے طے کیا کہ وقت ہو گیا ہے، اس لیے وقت پر نماز پڑھ لیں۔ اللہ کے رسول کی منشا یہ تھی کہ ہم جلد از جلد بنو قریظہ پہنچیں یہ نہ تھی کہ ہم تاخیر سے عصر پڑھیں، بعد میں اس کا تذکرہ نبی ﷺ سے کیا گیا تو آپ نے کسی کی نکیر نہ فرمائی۔[۲۹]

ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز عصر کی ادائی کے سلسلے میں صحابۂ کرام دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے: ایک گروہ نے حدیث کے ظاہر پر عمل کیا جسے احناف کے ماہرین اصول فقہ عبارۃ النص سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ نے نص حدیث سے ایک مفہوم کا استنباط کیا اور اس پر عمل کیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دونوں گروہوں کو درست قرار دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فہم حدیث کے دونوں منہج صحیح ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ نصوص کے متبادر اور ظاہر مفہوم کو اختیار کرے اور اگر وہ نص سے بعض معانی کا استنباط کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے تو یہ بھی درست ہے۔ دونوں منہاج اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ مذکورہ حدیث میں صحابہ کی ایک جماعت نے یہ سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ نے رفتار سفر کی سرعت پر زور دیا تھا۔ اس لیے بنو قریظہ کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی وقت پر نماز عصر کی ادائی سے حکم رسول کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔ رسول اللہ ﷺ کی منشا یہ تھی کہ لوگ جلد سے جلد بنو قریظہ کے علاقے

۲۹- طہ جابر العلوانی، **أدب الاختلاف في الإسلام** (ریاض: الدار العالمية للكتاب الإسلامي، ۱۴۱۶ھ / ۱۹۹۵ء)، ۳۵۔

تک پہنچ جائیں۔[۳۰] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص کے ظاہر پر عمل کرنا اسی طرح درست ہے جس طرح ان سے مستنبط کسی مفہوم اور معنی کو اختیار کرنا۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں آزادیِ فکر اور اختلاف رائے کی دوسری مثال وہ حدیث ہے جس کی روایت امام ابو دواؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے غزوہ ذات السلاسل میں شرکت کی۔ ایک سرد رات کو مجھے احتلام ہو گیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ نماز فجر سے پہلے اگر میں نے غسل کیا تو ہلاک ہو جاؤں گا، چناں چہ میں نے غسل کی جگہ تیمم کرنے کو ترجیح دی اور صحابہ کو نماز پڑھائی۔ لوگوں نے نبی ﷺ سے اس کی شکایت کر دی۔ آپ ﷺ نے مجھے بلا کر پوچھا: "اے عمرو تم نے جنبی ہو کر اپنے ساتھیوں کی امامت کر لی" میں نے آپ کو بتایا کہ کس خدشے کی بنا پر میں نے غسل نہیں کیا اور پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنْفُسَكُمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ (النساء، ۴: ۲۹) (اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔) راوی کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے اور خاموش ہو گئے۔[۳۱]

اسلام ہر فرد کو تنقید و احتساب اور اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی معاشرے کی اصلاح و ترقی سے اسے ہم آہنگ رکھنا چاہتا ہے۔ فرد کی آزادی اور معاشرے کی تعمیر و ترقی کے درمیان ارتباط و تنظیم فکر اسلامی کا امتیاز ہے۔ اس امتیاز کا صحیح ادراک نہ ہو تو اندھی تقلید و فکری انتہا پسندی اور تہذیبی و تمدنی بانجھ پن و کاروانِ علم کے پاؤں کی بیڑی بن جاتا ہے اور پھر کسی نئے فکر کے نمود کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے اور پوری امت تخلیقی و تہذیبی پس ماندگی کا شکار ہو جاتی ہے۔

۳۰- دل چسپ بات یہ ہے کہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معروف تصنیف **إعلام الموقعين** میں اس حدیث کی تعلق سے فقہاے کرام کے اختلافات نقل کیے ہیں اور یہ بحث چھیڑی ہے کہ صحابہ کرام کی دونوں جماعتوں میں سے کس کا موقف زیادہ درست اور صائب تھا۔ ایک گروہ فقہا کا اس بات کا قائل ہے کہ صحابہ کی وہ جماعت افضل تھی جس نے راستے ہی میں نماز ادا کر لی اور اپنے وقت پر نماز کی ادائی کا اہتمام کر کے دوسری جماعت پر بازی لے گیا۔ دوسرا گروہ یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ بنو قریظہ پہنچ کر نماز ادا کرنے والی جماعت صحابہ کا عمل افضل ہے۔ ڈاکٹر العلوانی تبصرہ کرتے ہیں کہ چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی جماعت پر تنقید نہیں کی اس لیے فقہا کی ذمے داری تھی کہ ہر دو عمل کو سنت رسول قرار دیتے اور اس پہلو پر بحث نہ کرتے جسے رسول اللہ نے خود نظر انداز کیا تھا۔ (العلوانی، **ادب الاختلاف**، ۳۵۔)

۳۱- ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی، **سنن أبي داؤد**، كتاب الطهارة، باب إذا خاف الجنب البرد أيتيهم (بیروت: المكتبة العصرية)، ۱: ۹۲، رقم: ۳۳۴۔

حریت فکر اور معاشرتی اصلاح وتعمیر کے درمیان ارتباط کی روشنی میں ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسلامی تصور کی جہتوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ معروف ومنکر کے تیئں یہ فریضہ حریت اعتقاد اور حریت فکر کے تعلق سے نصح وخیر خواہی اور ارشاد وہدایت کا کام دیتا ہے اور اجتماعی ومعاشرتی کردار کے تعلق سے یہ فریضہ معاشرہ کے تحفظ اس کے حقوق کی ادائیگی اور اس کے نظام کے تشخص کی حفاظت کے لیے فعل واقدام، جہاد وقربانی اور قدرت وطاقت کا کام دیتا ہے تاکہ معاشرہ کا سفینہ غرقابی سے محفوظ رہے، اس کی عمارت کو گزند نہ پہنچے، اس کی صفوں میں انتشار عام نہ ہو اور حیات ومعاشرہ کا اصلاحی وتعمیری مقصد پارہ پارہ نہ ہو۔[۳۲]

حریت فکر اور تعمیر وترقی معاشرے کے درمیان ارتباط کی بہترین وضاحت حدیث سفینہ سے ہوتی ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس کی روایت امام بخاری، امام ترمذی اور امام احمد وغیرہ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے کی ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مثل القائم على حدود الله والو قع فيها كمثل قوم استهموا على سفينة فأصاب بعضهم أعلاها و بعضهم أسفلها مكان الذين في أسفلها إذا استقوا من الماء مروا على من فوقهم فقالوا: لوأنا خرقنا في نصيبنا خرقًا ولم نؤذ من فوقمنا فان تركوهم هلكوا و هلكوا جميعًا وإن أخذوا على أيديهم نجوا و نجوا جميعًا.[۳۳]

وہ لوگ جو حدود اللہ پر قائم ہیں اور وہ جو ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان دونوں کی مثال اس قوم جیسی ہے جس نے ایک کشتی سے سفر کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگ اوپر منزل پر چلے گئے، جب کہ دوسرے لوگ نچلی منزل پر سوار ہوئے۔ نچلی منزل والوں کو پیاس لگتی تو وہ بالائی منزلوں سے گزر کر اوپر جاتے اور پیاس بجھاتے۔ انھوں نے سوچا کہ ہم نیچے کشتی میں سوارخ کرلیں تو اوپر والوں کو زحمت دینے سے بچ جائیں گے۔ اگر انھیں اپنے ارادہ کو پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو سارے لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تو نیچے کی منزل والے بھی بچ جائیں گے اور اوپر والے بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ یہ مثال بہت سے معانی وتصورات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس سے آزادی اور اس کی حدود کی صراحت ہوتی ہے۔ آزادی فکر اس حد تک مطلوب ہے جب تک اس سے معاشرے

۳۲۔ عبدالحمید احمد، **فکر اسلامی کا بحران**، ص: ۱۷۸۔

۳۳۔ محمد بن اسماعیل البخاری، **صحيح البخاري**، تشریح وتعلیق، مصطفیٰ دیب البغاء، كتاب الشركة ، باب هل يقرع في القسمة والاستهام فيه (دمشق: دارابن کثیر، ۱۴۴۰ھ / ۱۹۹۳ء)، رقم: ۲۳۶۱۔

کی تعمیر و ترقی پر زد نہ پڑے اور اس سر زمین کی عمران کاری اور خلافت کے خدائی منصوبے کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ (۳۴)

۶- اسلامیت اور انسانیت کے درمیان اعتدال

فکر اسلامی مذہب کی ایسی تعبیر و تشریح سے عبارت ہے جو ایک طرف قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کی صحیح ترجمانی کرتی ہو اور دوسری طرف عالم انسانیت کے مسائل سے سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ تعامل کرتی ہو۔ مسلمان سارے انسانوں کے درد و کرب کو سمجھنے اور ان کی خوشحالی و نجات کے لیے جدوجہد کرنے پر مامور ہیں۔ اللہ کے رسول تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ قرآن کریم تمام انسانوں کی ہدایت اور رہ نمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ مسلمان جس خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ رب العالمین ہے، رحمن و رحیم ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کی ذمے داری بتائی ہے کہ وہ سارے انسانوں کو اللہ کے دین کا مخاطب بنائیں اور اپنے رویے اور عمل سے ان کے لیے ہم دردی و غم خواری اور نصح و خیر خواہی کی مثال بنیں۔ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ ۲: ۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تم کو بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن کر رہو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔) ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران ۳: ۱۱) (تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ بھلائی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔) ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (المائدۃ ۵: ۲) (نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو مگر ظلم اور گناہ میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔)

دین کے اسی انسانیت نواز تعامل کو فقہا نے مقاصد شریعت کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مقاصد شریعت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مصلحت سے ہماری مراد مقصود شریعت کی حفاظت ہے اور شریعت کا مقصد خلق خدا کے سلسلے میں پانچ چیزوں سے عبارت ہے، وہ یہ کہ ان کے دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کی جائے، ہر وہ چیز جو ان پانچ بنیادی چیزوں کی حفاظت

۳۴- العلوانی، **تدبر قرآن کے اصول اور وسائل**، ۲۱۴- ۲۱۷۔

کرنے والی ہو مصلحت شمار ہو گی اور ہر وہ چیز جو ان بنیادوں کے لیے خطرہ ہو، مفسدہ شمار ہو گی جسے دور کرنا مصلحت قرار پائے گا۔(۳۵)

امام ابو اسحق شاطبی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۹۹ء– ۱۷۶۲ء)، محمد طاہر بن عاشور رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۷۹ء– ۱۹۷۳ء)، علال الفاسی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۰۸ء– ۱۹۷۴ء) وغیرہ علمانے اپنے دور میں مقاصد شریعت کے نظریے پر بحث کر کے اسلام کے انسانی و آفاقی اقدار کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا۔ پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی (۱۹۳۱ء) نے مقاصد شریعت پر گفت گو کرتے ہوئے تحفظ سے آگے بڑھ کر ترقی دینے کو بھی مقاصد میں شامل کرنا ضروری خیال کیا۔ روایتی فہرست مقاصد میں سارازور مضرت پر تھا، جلب منفعت کا پہلو دب گیا تھا۔ انھوں نے گلوبلائزیشن کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے روز نئے حالات میں سیاسی، سماجی اور معاشی امور میں دنیا کی رہ نمائی کرنے کے لیے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ان امور کو بھی مقاصد میں شامل کریں جن کی مقصودیت کو کتاب و سنت کی سند تو حاصل ہے مگر اس سے پہلے ان کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، وہ مقاصد یہ ہیں:

۱– انسانی عزو شرف

۲– بنیادی آزادیاں

۳– عدل و انصاف

۴– ازالۂ غربت اور کفالت عامہ

۵– سماجی مساوات اور دولت و آمدنی کی تقسیم میں پائے جانے والی ناہمواری کو بڑھنے سے روکنا

۶– امن و امان اور نظم و نسق

۷– بین الاقوامی سطح پر باہم تعامل و تعاون(۳۶)

۳۵– حامد الغزالی، **المستصفیٰ في أصول الفقه** (قاہرہ: مطبعة امیریة، ۱۳۲۴ھ)، ۱: ۲۸۷۔

۳۶– محمد نجات اللہ صدیقی، **مقاصد شریعت** (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ۳۹۔

یہ بحث شعبہ علوم اسلامیہ بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان پاکستان کے دو روزہ سیمینار ۲۸– ۲۹ مارچ ۲۰۱۶ء کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی بعد میں اس میں اضافے کیے گئے اور کچھ ترمیمات بھی تاکہ موضوع تشنہ نہ رہے۔ راقم شکر گزار ہے صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب کا جنھوں نے اسے دعوت سخن دی اور ایک اہم

مقاصد شریعت پر ہونے والی یہ بحثیں فکر اسلامی کے آفاقی اور عالم گیر پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لیے ہیں۔ آفاقیت اور انسانیت نوازی کی یہ ترجمانی فکر اسلامی کا امتیاز ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے سنہری دور میں اسی عالم گیر کردار کا مظاہرہ کیا۔

مسلمان اپنے ماحول میں محصور ہو کر اپنے مسائل و مشکلات کے گرداب میں پھنس کر عالم انسانیت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ انھیں خیر امت کا لقب اللہ کی بارگاہ سے ملا ہے اور اس لقب کا تقاضا بتایا گیا ہے کہ وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں۔ عام انسانوں کے درد و کرب کو سمجھیں اور اس کا مرہم فراہم کریں۔ عبادت اور خدمت کی اسی جامعیت کو اسلام کہتے ہیں یہاں سورۃ الحج کی آخری دو آیات کا مطالعہ مفید رہے گا، جس سے فکر اسلامی کا امتیاز نکھر کر سامنے آئے گا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴾ (الحج ۲۲: ۷۷–۷۸)

(اے ایمان والو! رکوع کرو سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمھارے باپ ابراہیم کی ملت کو تمھارے لیے پسند فرمایا۔ اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمھارا نام مسلم ہے تاکہ رسول ﷺ تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمھارا آقا ہے اور کیا ہی خوب آقا اور کیا ہی خوب مددگار ہے۔)

موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کا موقع دیا۔ جی چاہتا ہے کہ مصر کے نامور عالم شیخ محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۱۷ء– ۱۹۹۶ء) کا یہ اقتباس یہاں ملاحظہ کیا جائے:

"بڑی قومیں کثرت تعداد کی بنا پر ترقی کا بام عروج پر نہیں پہنچیں، بلکہ عقلی پیداوار اور تہذیبی ارتقا نے انھیں اس منزل تک پہنچایا۔ یہ عقلی ترقی عوامی بھیڑ کے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ ارباب عقل و دانش اور حاملین فکر و نظر کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ ہر کوئی قوم اس وقت خود اپنے پیروں پر کلہاڑی چلاتی ہے جب وہ اپنے عبقریوں کو گرفتار کرتی اور کوڑے لگواتی ہے اور پست ہمت لوگوں اور اوچھی طبیعت کے انسانوں کو انعامات سے نوازتی ہے۔" الدعوۃ الاسلامیۃ تستقبل قرنہا الخامس عشر، عبید اللہ فہد فلاحی کے ذریعہ اردو ترجمہ دعوت اسلامی، پندرہویں صدی ہجری کے استقبال میں، ہندوستان پبلی کیشنز، دہلی، نومبر ۱۹۸۱ء، ۴۸۔

ان آیات میں رکوع، سجدہ، عبادت اور **فعل الخیر** کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے۔ رکوع و سجدہ نماز کی تعبیر ہے اور **اعبدوا** کا حکم خاص کے بعد عام کا حکم ہے اور عبادت اطاعت کے مفہوم کو بھی شامل ہے پھر **افعلو الخیر** سے اشارہ خدمت انسانیت کی طرف ہے۔ نیکیوں اور بھلائیوں کا دائرہ عام انسانوں تک وسیع ہو۔ انسانوں کی خدمت فضائل و مکارم ہی نہیں، بلکہ فرائض و اوامر میں شامل ہے۔ خدمت اور عبادت کے درمیان توازن قائم ہو جائے تو اسلام مکمل ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اللہ کا عبادت گزار ہو اور خادم انسانیت بھی تو اس کی عبدیت مکمل ہو جاتی ہے۔

وَجَاهِدُوْا کا حکم دے کر اللہ نے اخلاقی روحانی تیاری کے ساتھ علمی جدوجہد کی ہدایت بھی کر دی۔ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے ہر قسم کی جدوجہد کرنا ضروری ہے مگر ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ ہر طرح کی سہولت و رخصت کا اس میں خیال رکھا گیا ہے اس لیے اعتدال اور توازن مطلوب ہے۔

آگے مسلمانوں کو شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا خطاب دیا گیا ہے۔ اللہ نے ساری امتوں کو معزول کر کے امت مسلمہ کا انتخاب کیا ہے تاکہ وہ قیامت تک خلق خدا پر اللہ کے دین کو پیش کرے اپنے قول سے بھی، رویے اور عمل سے بھی۔ اس شہادت کے فریضے کا تقاضا ہے کہ وہ پورے عزم و جزم کے ساتھ خادم انسانیت بن کر ابھرے اور رحمۃ للعالمین ﷺ کا امتی بن کر سارے عالم کے لیے رحمت و سعادت کی مثال بن جائے۔ اسی سے فکر اسلامی کی معاصر ترجمانی ہو گی۔ دور جدید میں فکر اسلامی کی مؤثر ترجمانی کا فریضہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا ہے جن کی فکر اور تحریک برصغیر میں کام کرنے والی تمام دینی و اصلاحی قوتوں کے لیے تھوڑے سے رد وبدل کے ساتھ مثالی نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے ایک طرف حدیث وفقہ کے ذخیرہ میں پائی جانے والی علمی کشاکش کو دور کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف تمام فقہی مکاتب فکر کے درمیان تلفیق و تطبیق کی مبارک جدوجہد کی۔ تیسری طرف شریعت و طریقت کے متبادر تصادم کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور چوتھی طرف دین اسلام کی عقلی اور انسانیت نواز تفہیم و تعبیر کا فریضہ ادا کیا۔ نظام فطرت سے قربت اور عالمی رجحانات کے ادراک نے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفہیم دین کو زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔

۞۞۞۞۞۞